ایک لمحہ ۔ ایک صدی

شکیل جمالی (ایک خاکہ)

ابن سعید

"گرمی کی دوپہر تھی"۔ اسٹیشن سے تین میل پیدل چلنے کے بعد جب میں گاؤں میں پہونچا تو پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ کنویں کے پاس چچا کھڑے تھے۔ اور کنویں کے بغل میں جو چھپر تھا۔ اُس میں ایک صاحب بیٹھے تھے۔ اشارے سے چچا سے تعریف پوچھی تو انھوں نے اِس طرح سے نام لیا جیسے برسہا برس سے میں اِس نام سے آشنا ہوں۔ میں نے اُن کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر سر ہلاتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب باہر آیا تو باقاعدہ تعارف ہوا۔ موصوف کا لہجہ اور بات کرنے کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ آدمی اپنے سوچنے کا ڈھنگ الگ رکھتا ہوگا۔

ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔ اسی سال میں نے ایف۔ اے کا امتحان دیا تھا۔ اس لئے عام طالب علموں کی طرح میں نے انھیں اپنے پرچوں کے بارے میں بتایا امتحان کے اس کمرے کے بارے میں بتایا جس میں ایک لڑکی سنترے کھا کر چھلکے

ہم لوگوں کی طرف پھینک دیا کرتی تھی۔ ان دوستوں کے بارے میں جو جھوٹ بولنے میں استاد ہوتے تھے۔ اور جنہیں کالج کی زبان میں "کاگا" کہاجاتا تھا...... غرضکہ بہت کچھ بتاتا رہا وہ ہنستے رہتے تھے۔ کبھی زیرِ لب مسکراتے۔ کبھی جی کھول کر ہنستے، اور کبھی قہقہہ لگا تے ـــــ غالباً اخلاقاً۔

ہم لوگ دیہات کی فضا میں کئی دن ساتھ رہے۔ پھر جب الہ آباد آئے تو یہاں بھی حالات نے ساتھ ہی رکھا۔ اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ اور میرے اندر یہ احساس قوی ہوتا گیا کہ میرا ساتھی اُس جمالیاتی ذوق کا حامل ہے جو انسان کو نکھرنے اور سنورنے میں مدد دیتا ہے۔ اُنہی زمانے میں ماہنامہ نکہت کا آغاز ہوا۔ اور ہم دونوں کے ساتھیوں میں راہی معصوم رضا۔ اسرار احمد اور ملک زادہ منظور احمد کا اضافہ ہوا۔

اُسی زمانے میں نکہت کے دوسرے شمارے میں ایک کہانی کا عنوان تھا "چار پیسے" وہ جمال رضوی وہی صاحب تھے جن سے دیہات کی ایک دوپہر میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور جو آج کل شکیل جمالی کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔

جمال رضوی کی ایک حیثیت نکہت کلب کے ناظمِ اعلیٰ کی بھی تھی۔ دانا پور گورکھپور، اعظم گڑھ وغیرہ میں نکہت کلب کی ہنگامہ خیز کانفرنس اور انمیں جمال صاحب کی موہنی شخصیت رہتی۔ شیروانی پہنے، چشمہ لگائے۔ کبھی تیز لہجے میں کبھی نرمی سے بھی بھرائی ہوئی آواز میں گفتگو کرتے۔ تو گرمئ گفتار میں حسنِ اخلاق اور محبت کا براہ راست اثر پڑتا۔ چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں میں خلوص کی بے پناہ لہریں کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔

۵۱ء سے ۵۳ء تک جمال رضوی رہے اور پھر جمال رضوی رومانی دنیا کے مقبول ناول نگار شکیل جمالی میں ڈھل گئے۔ حلقۂ احباب میں وہ اسرار اور

راہی کیلئے تھے، بقیہ دوستوں کیلئے وہ جمال صاحب تھے۔ اور عوام میں شکیل جمالی لیکن اُن کی تینوں شخصیتیں ہم آہنگ تھیں۔ نہ اُن میں کسی طرح کا کلف تھا نہ دھونسانے کی کوشش ـــــ وہ یاروں کے یار ہمیشہ رہے، ہنستے، قہقہہ لگاتے ـــــ دراصل اُن سے لڑنا، جھگڑنا اسی لئے بڑا مشکل کام تھا کہ انھیں غصہ آتا ہی نہ تھا۔ بہت بگڑے تو چڑچڑائے اور یہ بھی رقص شرر کی طرح ـــــ زندگی کے بارے میں ان کا ذہنی رویہ ہمیشہ یہ رہا کہ کوئی شے خوشگوار ہوتی نہیں اُسے خوشگوار بنایا جاتا ہے خوشیاں اور مسرتیں بازار میں بکتی نہیں۔ آدمی خود ان کی تخلیق کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے زندگی کی ہر پہلو کو ہنس کے نباہے بھول جانے کی کوشش کی ہے۔

وہ "حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم رہے۔" ایک طویل عرصے تک ان کے بغیر سنیما دیکھنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ میں اور راہی اور کبھی کبھی جب راہی نہیں رہتے ۔۔ تھے تو پیارے لال آوارہ کا ساتھ رہتا تھا فلم سے اُن کی دلچسپی کا ایک رخ تو وہ بھی تھا جب لے آر کاردار صاحب ان کی کہانی فردوس فلمانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور اُن کی دعوت پر وہ بمبئی گئے تھے۔

اس زمانے میں جمال صاحب کے سامنے کچھ" داؤں پیچ " اور" جوڑ توڑ" کی تجاویز پہونچیں ۔ تو جنوری ۵۷ء میں انھوں نے مجھے ایک خط میں لکھا۔

" انسان کی خودداری کی قیمت بہت بڑی ہوتی ہے اور میری رگوں میں بھی ایک خوددار، باپ کا خون ہے۔ میں کسی قیمت پر یوسف صاحب کو اس پیچ میں ڈالنا پسند نہیں کروں گا"

۶۰ء میں مغل اعظم کا بڑا شور تھا۔ مجھے خط میں لکھا۔

اگر تم یہاں موجود ہوتے تو کیا میں اس وقت دفتر میں بیٹھا رہتا۔ یچ کہتا ہوں کہ بغیر تمہارے مغل اعظم دیکھنے کی قطعی طبیعت نہیں چاہتی"

اور جب انھوں نے مغل اعظم دیکھا تو مجھے لکھا:۔

"فلم مغل اعظم خلاف توقع ناکامیاب رہی۔ سیٹ اچھے ہیں لیکن ٹیکنی کلر ہونے کی وجہ سے ابھر نہیں سکے۔ مکالموں کی ادائیگی بے حد خراب ناقابل برداشت حد تک...... صرف دو گانے کچھ اچھے ہیں"

لیکن ۶۵ء کے بعد سے ان کی دلچسپیاں فلم سے بتدریج کم ہوتی گئیں اور پھر ختم ہو گئیں۔

وہ ہم لوگوں کے ناولوں پر بھی بڑی بے لاگ رائے دینے کے قائل ہیں۔ ایک ناول "ابھی کچھ رات باقی ہے" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"واصف صاحب کے کردار کا وہ رُخ جب وہ اپنی بیوی عصمت پر شک کرنے لگتا ہے بہت ہی عمدہ ہے۔

"تم نے عصمت کا کباڑہ بڑی بے دردی سے کیا ہے۔ وہ حشر میں تم سے دامن گیر ہو گی۔ اور ایک راز کی بات اور۔ اسکے جھنجھوڑنے میں ذہنی طور پر تم بھی شامل ہو۔ اس کے مرنے میں مصنف کی سازش معلوم ہوتی ہے۔ جو نیا طریقہ تم نے استعمال کیا ہے وہ بہت بے دردانہ ہے۔ مری طرف سے اس کی قبر پر فاتحہ پڑھ دینا"

"نو صاحب بہت گریٹ آدمی ثابت ہوئے تھے خاص طور سے جب وہ اپنی سالی کی ذہانت اور حاضر جوابی کی تعریف کرتے ہیں"

وہ بڑی سنجیدگی سے بعض مسائل پر لکھتے رہے۔ مثلاً یہ خط بہت اہم ہے ۳ر اکتوبر ۹۳ء کو انھوں نے لکھا۔

"تم اس مضمون میں شروع ہی سے خواہ مخواہ کے لیے CAUTIOUS ہو گئے۔ اور اپنے اندر ایک "مدرس" کی تخلیق کر بیٹھے جس کی گرفت سے تم آخر وقت

تک آزاد نہیں ہو سکتے میں صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا۔ مدرس کوئی الگ صنف ہوتی ہے۔ جو کسی معین کردہ اصولوں پر ہی چلتی ہے اور اپنے خود ساختہ اصولوں کے باہر کچھ دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ورنہ اس کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ ابن صفی نہ تو پرانی کسوٹی پر کسے جا سکتے ہیں اور نہ ہی معین شدہ اصولوں کے پیمانے میں ناپے جا سکتے ہیں مطالبہ ان کی انفرادیت ہم سے کرتی ہے۔

میں اپنی معلومات کے لئے تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اردو ادب میں ایسا مصنف گزرا ہے جس نے اپنی ہی زندگی میں تین نسلوں کو یکساں طور پر متاثر کیا ہے۔ کیا پڑھنے والوں کا اتنا بڑا حصہ کسی دوسرے مصنف کے حصے میں آیا تھا جس میں ہر طبقے اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگ شامل ہوں۔

کیا کوئی ادیب بیک وقت جاسوسی ناول نگار، شاعر اور طنز نگار بھی تھا اور تینوں اصناف میں اس نے نئی نئی راہیں پیدا کرکے اپنی انفرادیت برقرار رکھا ہو۔

ابن صفی کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ تم سے بڑھکر کون لگا سکتا ہے۔ تو کیا یہ بات تحقیق طلب نہیں ہے کہ ان کی اس بے پناہ مقبولیت کے پیچھے آخر کون سا راز ہے تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ابن صفی صرف اس حلقے میں ہی مقبول نہیں تھے جسے "عوام کا حلقہ" کہا جاتا ہے بلکہ وہ خواص کے طبقے میں بھی اسی طرح پسند کئے جاتے تھے تو آخر ان کے ناولوں میں وہ کون سی خوبی تھی جس نے ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کو متاثر کر رکھا تھا؟ مجھے امید تھی کہ تمہارے مضمون میں ان تمام سوالات کے جواب ضرور مل جائیں گے۔ تمہارے علاوہ بھلا اور کون لکھ سکتا ہے"۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہر موضوع پر اپنی رائے رکھتے ہیں اور اس رائے کے اظہار میں ہچکچاتے نہیں بلکہ پورے استدلال کے ساتھ

اسے پیش کرنا چاہتے ہیں مگر اس طرح کہ لہجہ دل شکن نہ ہو۔ وہ وسیع تر تناظر میں بہت سارے مسائل کو پرکھنے کے قائل ہیں۔ حیدر آباد کے فسادات پر انھوں نے ایک خط میں مجھے لکھا۔

"حیدر آباد کے حالات سن سن کر دل پریشان ہے۔ اس بار فسادات نے کافی طول پکڑ لیا ہے۔ خدا کرے اب امن واماں ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ترقی یافتہ اور تہذیبی دور میں آخر انسان خود اپنے کو کب تک قتل کرتا رہے گا۔ خود اپنے ہی گھروں میں کب تک آگ لگاتا رہے گا۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس کے بعد بھی انسان اپنے کو مہذب اور ترقی یافتہ ہی کہلاتا ہے۔ خدا ان پر رحم کرے اور نیک ہدایت عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ تم اس ماحول میں یقیناً کرب، بےچینی اور گھٹن محسوس کر رہے ہو گے" ان اقتباسات سے ان کی جو تصویر بنتی ہے وہ ایک خوفناک حد تک سنجیدہ آدمی کی ہے۔ وہ سنجیدہ بے شک ہیں لیکن خوفناک نہیں وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ہنسنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اور تنہا نہیں ہنستے بلکہ دوستوں کے قافلے کو ساتھ لئے چلتے ہیں۔ سیکڑوں واقعات میں سے صرف ایک پیش کیا جارہا ہے۔

تقریباً بیس سال پہلے ایک عزیز دوست جو عمر میں کافی چھوٹے تھے اس کی شادی کا مسئلہ پھنسا ہوا تھا روزانہ رات میں ان کے یہاں احباب کی نشست میں یہ اہم مسئلہ پیش ہوتا۔ کسی نہ کسی رشتے پر بحث ہوتی اور پھر یا تو وہ رشتہ نامنظور ہو جاتا یا پھر یہ معلوم ہوتا کہ لڑکی والوں نے رشتہ نامنظور کر دیا ہے۔ رات میں ایک دو بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ دس بارہ دن کے بعد ایک روز رات میں تقریباً ۲ بجے جب سب لوگ اپنے اپنے گھر جارہے تھے تو سڑک پر پہونچ کر جمال صاحب نے سب کو روک کر کہا۔

"ایک ضروری بات آپ لوگوں کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں"
سب لوگ رک کر جمال صاحب کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔
"میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سعادت کی شادی ہو یا نہ ہو مگر مجھے تو چار پانچ طلاقیں ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔
اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا تھا۔
یہی وجہ تھی کہ حلقہ احباب میں انھیں وکیل پھانسی کہا جاتا تھا اسلئے کہ جس کسی کے خلاف فردِ جرم عائد ہوتی جمال صاحب اسے سولی پر چڑھائے بغیر سانس نہ لیتے۔ اور مزیدار بات یہ ہے کہ مجرم پھانسی کے پھندے کی لذت سے گردن سہلاتا رہتا تھا۔

انھوں نے کبھی ذاتی شخصیت کی نمائش کو پسند کیا اور نہ کبھی یہ ظاہر کیا کہ وہ عام آدمیوں سے الگ کوئی مخلوق ہیں۔ اُن سے ہمیشہ دیر ہوتی رہی ہے۔ چاہے ناول لکھنا ہو یا کسی تقریب میں شرکت یا مجھے کسی تحفہ سے نوازنا۔ وہ کہتے ہیں۔
"میرے یہاں دیر کبھی ہے اور اندھیر بھی ——— !"
وہ افواہوں پر کان دھرتے ہیں۔ اُن کے ایک بہت پیارے عزیز جو ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف کے مصداق ہیں شہر کی تمام افواہیں انھیں آ کر سناتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح اُن کی باتیں سنتے ہیں جیسے بی بی سی لندن سُن رہے ہوں۔ میں نے ایکبار احتجاج کیا۔ ارشاد ہوا۔
"ان افواہوں کو چھان پھٹک کر غور کرنا چاہئے۔ ایک ریزہ سچ کے لئے ڈھیر ساری دھول مٹی گوارا کرنی ہی پڑتی ہے"
وہ بھیا کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں۔ ہندوستانی روایات میں جو بھائی کا کردار لکشمن سے لے کر اودل تک ہے" وہ اُس کے امین رہے۔ بڑی وفاداری

سے جولائی ۱۹۸۰ء تک اس روایت کو پلکوں پر سنبھال کر نباہتے رہے۔

یہی نباہ دوستوں کے ساتھ بھی رہا۔ امرار سے دو بار ملنے کراچی گئے حتی الامکان راہی کے ساتھ بھی ساتویں آٹھویں دہائی تک تعلقات کو گھسیٹتے رہے۔ اور اوّل تو ان کی سرشت میں جو مروت ہے اُس کی وجہ سے اُن سے کوئی بے وفائی کیا کرے گا۔ اور کبھی کسی نے ایسا کیا بھی تو انھوں نے تھوڑی سی تحریف کے ساتھ پڑھ دیا۔ ؎

تم نے اچھا کیا' نباہ نہ کی!

آج بھی وہ بے شمار ناموں کے جھرمٹ میں اپنی اُسی مروت کو نباہ رہے ہیں' غیر اہم باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ الکشن کا نقشہ بنواتے ہیں' لوگوں کے شادی کے کارڈ لکھتے ہیں یا محلے ایک لڑکے کی خاطر سیاسی رہنما کے لئے بیان لکھ دیتے ہیں جس کی انھوں نے شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔ ہاتھ میں رومال لے کر بیوی کے ساتھ گھنٹوں اس پر بحث کرتے ہیں کہ رومال جیب میں ہی تھا کیا ہوا! اپنی نواسے' نواسی' پوتیاں' بہوئیں۔ لڑکیاں' داماد غرضیکہ ایک بہت بڑے خاندان میں ہر ایک کے پاس بہو بکر محبت سے پیش آتے ہیں۔ ان کے مسائل میں حصہ لیتے ہیں اور یہی روزانہ کے چھوٹے موٹے واقعات عام قسم کے افراد ان کے ناولوں کا موضوع بن جاتے ہیں۔ ان کے ناول سحر ہونے تک کے چنگیزی فریب کی آمنہ لہراتے آنچل کے بڑے میاں دل ناداں کے معموم صاحب' بدنظر کے۔ .جمان صاحب تخیلی افراد نہیں بلکہ حقیقی شخصیتیں تھیں اور اپنے اپنے حلقے میں بہت مقبول اور خصوصاً اسلام بیگ چنگیزی مرحوم اور بڑے میاں۔

ایک ناول خوشبو کی آواز لکھ رہے ہیں . . . . اسمیں بھی یہی حقیقت نگاری موجود ہے۔

اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ تخلیق کار زندگی کا براہِ راست مطالعہ اور مشاہدہ کرے اور اس سے قوت حاصل کرے۔ عموماً ناولوں میں علم سفینہ زیادہ ہوتا ہے علم سینہ کم۔ کتابوں ہی کی بات دہرا دی جاتی ہے اصل زندگی کی نہیں۔

ہم سب ساتھیوں کا ایک اصول ہمیشہ سے رہا اور وہ یہ کہ بے راہ روی انحراف اور غیر ذمہ داری ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ جمال صاحب نے بھی اس اصول کو بنایا۔ اپنی ہر ذمہ داری نبھائی۔ کامیاب عملی زندگی گزاری۔ لیکن وہ بھی اس وارفتگی کو شکار رہے جو زندگی میں جذبۂ تخلیق کو بیدار کرتی ہے جس سے محبت کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ میرے ان کے درمیان طرزِ فکر کا اتفاق نہیں اختلاف زیادہ رہا ہے۔ لیکن وہ وارفتگی یا وہ پاکیزہ دیوانگی جو زلفوں کی برہمی پر مچل جانا سکھاتی ہے جہاں دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں کوئی فاصلہ نہیں رہ جاتا اور جہاں زندگی نام ہی ہے دل کی دھڑکنوں کا وہاں ہم دونوں متحد خیال رہے ہیں۔ ایک ساتھ دونوں نے مسلسل یہ شعر پڑھا ہے ؎

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

شاید یہی دُکھا ہوا دل انسانی زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے بمشکل جمالی کو یہ نعمت میسر ہے اور جسے یہ نعمت مل جائے اسے پھر اور کیا چاہیے!

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو
میرا مجلسی تبسم میرا ترجماں نہیں ہے

(مصطفےٰ زیدی)